R. No. 2186/57 · Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Phone—29
Annual Rs. 5/-
per Copy-15 P.

1-8-15-22

جلد ۲۷۔ شمارہ ۱۶ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء

اداریہ

اقبال کی یاد میں

رومین رولاں نے کہا ہے کہ "بڑا ادیب یا شاعر ساری دنیا کی ملکیت ہوتا ہے" اقبال چونکہ ایک بڑے شاعر ہیں اس لیے وہ بھی ساری دنیا کی ملکیت ہیں، کسی ایک ملک کا ان پر اجارہ نہیں۔

اقبال کو کچھ لوگ اس لیے بڑا شاعر کہتے ہیں کہ انھوں نے فلسفہ نظم کیا ہے۔ کچھ لوگ ان کے اس لیے قائل ہیں کہ وہ حرکت یا امید کا پیغام دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک چونکہ ان کی شاعری اسلام دوستی کو بیدار کرتی ہے اس لیے قابلِ قدر ہے۔ حالانکہ بڑے شاعر کے یہاں صرف موضوع کی اہمیت نہیں ہوتی، موضوع اور اسلوب دونوں کے اس طرح حل ہو جانے کی اہمیت ہوتی ہے کہ ایک غیر فانی کارنامہ وجود میں آجائے۔

اقبال اپنے مذہبی یا فلسفیانہ یا سیاسی خیالات کی وجہ سے اہم نہیں۔ شاعری مذہب یا سیاست یا فلسفہ کا بدل نہیں۔ اس کی اپنی اہمیت ہے کیونکہ وہ ایک ایسی بصیرت عطا کرتی ہے اور ایک ایسی نظر دیتی ہے جو زندگی میں اپنی الگ قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اقبال کی شاعری کی اہمیت یہ ہے کہ انھوں نے انسان اور اس کے مسائل کو شاعرانہ کمال کے ساتھ بیان کیا۔ اور شاعری کو جو عام طور پر حدیثِ حسن و عشق سمجھی جاتی تھی صحیفۂ کائنات بنا دیا۔ وہ انیسویں صدی کے آخر کے اس ذہن کی پیداوار ہیں جو مغرب کے اثر سے مشرق کو نئے سرے سے دریافت کر رہا تھا۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے نظم کو ترقی دی اور اسے ہر خیال کے اظہار کے قابل بنا دیا۔ پھر انھوں نے ہندستان کی عظمت کے ترانے گائے، فطرت کے حسن کی عکاسی کی، اپنے دور کے اہم واقعات کی دائمی معنویت واضح کی، ماضی و حال کے رشتے پر روشنی ڈالی، قوموں کی تاریخ کا حل پیش کیا اور یہ سب ایسے الفاظ میں پیش کیا جو ذہن پر ایک غیر فانی نقش چھوڑ دیتے ہیں۔ اقبال کو آجکل کچھ صرف ان کے خیالات کی وجہ سے اچھا یا بُرا کہتے ہیں حالانکہ شاعر کے خیالات سے اتفاق ضروری نہیں۔ صرف یہ دیکھنا کافی ہے کہ شاعر نے جو ذہنی تصویریں پیش کی ہیں ان میں ربط اور معنویت ہے یا نہیں۔ ہومر، کالی داس، دانتے، ملٹن کے خیالات سے آج اتفاق مشکل سے کیا جا سکے گا مگر ان شعرا کی اہمیت اور معنویت اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہمیں ایسی ذہنی تصویریں دیتے ہیں جن سے ہمیں آج بھی مسرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

اقبال کے ساتھ ہندستان اور پاکستان دونوں میں بے انصافی ہوئی ہے۔ ہندستان میں ان کا نام لیا جائے تو کچھ لوگ انھیں پاکستان بنانے والا کہہ کر نظر انداز کرتے ہیں اور پاکستان میں اسی وجہ سے ان کی پرستش ہوتی ہے مگر ان کا عرفان نہیں ہے۔ نہ ان کی نئی مشرقیت کا احساس ہے اور نہ مغرب کے خلاف ان کے اعلانِ جنگ کی روح کو سمجھا گیا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اقبال کی شاعری کی خصوصیات کو اور واضح کیا جائے۔ ان کے یہاں جو استعارے اور تشبیہیں ہیں، جو بلاغت ہے، جو تخیل کی پرواز ہے، جو علوم کی روح ہے، جو مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی ہے اور اس کے ساتھ جو زمین کے ہنگاموں کو سہل کرنے کا عزم ہے، وہی خاص چیز ہے اور اس کی اہمیت ہے۔

اقبال کو کچھ لوگ صرف ماضی پرست کہہ کر بھی نظر انداز کرتے ہیں حالانکہ اقبال کو حال اور اس کے درد و کرب کا جو احساس تھا وہ کم لوگوں کو رہا ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ آج کی زندگی اتنی پیچیدہ ہو گئی ہے اور سائنس کی ترقی اور سرمایہ و محنت کی آویزش نے ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں کہ جب تک ہم زندگی کا ایک جامع تصور نہ پیدا کریں گے اور ماضی و حال اور مستقبل کے رشتے کو اچھی طرح نہ سمجھیں گے، اس وقت تک ہم اس زندگی کے مطالبات پورے نہ کر سکیں گے اور یا تو زندگی ہمیں چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گی یا ہم زندگی کے دھارے پر تنکے کی طرح بہنے لگیں گے اور ہماری اپنی کوئی حقیقت باقی نہ رہے گی۔

شاعری کی ہمارے یہاں اب تک قدر غلط وجوہ پر ہوئی ہے۔

وہ ہمیں جمالیاتی ذوق دیتی ہے، زندگی کی بصیرت دیتی ہے، انسانی نفسیات کا محرم بناتی ہے اور انسان کے ہر رنگ سے آنکھیں چار کرنا سکھاتی ہے۔ اقبال کی عظمت کا یہی راز ہے اور اس عظمت کا عرفان ابھی تک عام نہیں ہے۔ ہمیں اسی کی کوشش کرنی چاہئے۔

مولانا آزاد کی یاد میں نمائش

نئی دہلی، مولانا ابوالکلام آزاد کی دسویں برسی کے سلسلے میں یہاں مولانا آزاد کی کتابوں اور ان پر لکھی جانے والی کتابوں کی ایک نمائش کی گئی ہے۔ نمائش میں جو ڈیڑھ سو کے قریب کتابیں، مسودے اور تحریریں شامل ہیں، ان میں بعض بہت ہی نادر اور نایاب ہیں۔ نایاب چیزوں میں مولانا کے تذکرہ کے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ بھی شامل ہے۔ یہ کتاب مولانا آزاد نے ۱۹۱۶ء میں لکھی تھی جب وہ رانچی (بہار) میں نظربند تھے۔ مزید نوادرات میں ان کے والد مولانا خیرالدین کی تصنیفات، ان کے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین کی کتابیں اور ان کی بہن آبرو بیگم کی کتابیں شامل ہیں۔ نمائش کا افتتاح آزادی کی لڑائی کے ایک پرانے مجاہد منشی عبدالقادر نے کیا۔ (قومی آواز)

اقبال کے نظریات پر فلم

لندن، حال ہی میں لندن میں ایک فلم علامہ اقبال پر ٹیلیویژن میں دکھائی گئی جس کو ایجی کا دار نے تیار کیا ہے۔ یہ فلم شاعرِ مشرق کے عالمی نظریات اور خیالات کے تعارف پر مشتمل ہے۔ (نگار)

بیادِ غالب

پاکستان میں ادارۂ یادگارِ غالب کے سالانہ اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے فیض احمد فیض نے اعلان کیا ہے کہ مشہور مصور صادقین غالب کا ایک مصور دیوان پیش کر رہے ہیں اور خواجہ معین الدین غالب پر ایک ڈرامہ لکھ رہے ہیں۔

(نگار)

سید حسین علی خاں

سوال و جواب

سوال

اسیرِ دامِ خرد ہوں نہ میں ہوں دیوانہ
نہ صبح شہر ہے میری نہ شام ویرانہ
تڑپ ہے میری مسلسل غیاب ہو کہ حضور
خدا سے دور ہوں اپنی خودی سے بیگانہ
بتا مجھے کہ یہ احساسِ تشنگی کیا ہے
کہ تو ہے محرمِ رازِ درونِ میخانہ

جوابِ اقبال

صدا یہ دور سے آئی حسن ہے رہینِ مجاز
تری حیات کا جادو تمام افسانہ
نہ بادہ ہے نہ صراحی نہ دورِ پیمانہ
فقط نگاہ سے رنگیں ہے بزمِ جانانہ"

پنجاب میں پنجابی کو سرکاری زبان بنانے کی تقریب

پٹیالہ، حکومتِ پنجاب نے حکم دیا ہے کہ پنجابی کو سرکاری زبان بنائے جانے کی تقریب ایک ہفتہ تک منائی جائے۔ پہلی جنوری سے تمام ضلعوں اور ڈویژنوں کی سطح پر سرکاری کام پنجابی زبان میں ہونے لگا تھا۔ پنجابی ادیبوں اور صحافیوں نے اس زبان کی جو خدمت کی ہے اس کے معاوضہ کے طور پر سوا لاکھ روپے کی رقم تقسیم کی جائے گی۔ اس سلسلہ میں پنجابی یونیورسٹی کی طرف سے انگریزی اور پنجابی زبان کی ایک لغت چھاپی جا رہی ہے جو ۵۰ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔ (قومی آواز)

سوویت شاعروں نے کل ہند شعرا کانفرنس میں کلام سنایا

کلکتہ، ممتاز سوویت شعراء اور فرانس سلیمانوف اور مادام ایگا کرا کوو دا کا کل ہند شعرا کانفرنس میں ہندوستانی شعراء و ادیبوں نے گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔ یہ کانفرنس ۱۹ اپریل کو شروع ہوئی۔ مرکزی وزیرِ تعلیم ڈاکٹر تریگنا سین نے راشٹرپتی بھون میں اس تین روزہ کانفرنس کا افتتاح کیا۔ مشہور بنگالی ناول نویس تارا شنکر بنرجی نے اجلاس کی صدارت کی۔ سلیمانوف اور سوویت شاعرہ نے اپنی اپنی زبان میں اپنا کلام سنایا۔

الٰہ آباد اسٹیشن کا اردو نام غائب

ابھی چند ہفتہ قبل تک الٰہ آباد اسٹیشن (جنکشن) پر بورڈ کے اوپر ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو میں بھی لفظ "الٰہ آباد" لکھا تھا مگر اس مرتبہ جو رنگائی ہوئی تو اردو کو مٹا کر صرف ہندی اور انگریزی کو باقی رکھا گیا ہے۔ (ریاست)

روسی لغت تیار

ماسکو، کرغیزیہ کی یونیورسٹی کے پروفیسر کونستین یودہن کو کرغیز روسی لغت تیار کرنے کے یادگار کام کے صلہ میں سوویت یونین کا ریاستی انعام عطا کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کرغیز زبان کے خصوصی علمی مطالعہ کا کام ۱۹۲۰ء میں شروع ہوا جبکہ کرغیزیہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کرغیز زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ (قومی آواز)

مظفر اقبال

اردو میں خواتین کا اولین ناول — اصلاح النساء

اردو میں ناول نگاری کی کوئی مستند تاریخ اب تک مرتب نہیں کی جاسکی ہے اور اسی لئے اس قسم کے سوالات اکثر اٹھائے جاتے ہیں کہ اردو کا پہلا ناول کون ہے؟ کیا نذیر احمد دہلوی اردو کے اولین ناول نگار ہیں؟ مراۃ العروس اور بنات النعش کو اردو کا پہلا ناول کہا جاسکتا ہے یا نہیں؟ مولوی کریم الدین کی کتاب خط تقدیر کو ناول کہنا کس حد تک درست ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ ان سوالات کا تشفی بخش جواب علی عباس حسینی کی کتاب اردو ناول کی تاریخ و تنقید میں ہے اور نہ محمد احسن فاروقی کی اردو ناول کی تنقیدی تاریخ میں۔ سکسینہ کی تاریخ ادب اردو، ڈاکٹر اعجاز حسین کی مختصر تاریخ ادب اردو، وقار عظیم کی داستان سے افسانے تک اور حامد حسن قادری کی داستان تاریخ اردو وغیرہ صرف درسی ضرورتوں کو پورا کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور اس لئے اس قسم کے سوالات کا جواب ان میں تلاش کرنا لاحاصل ہے۔ البتہ محمد صادق کی تاریخ ادب اردو بہ زبان انگریزی (HISTORY OF URDU LITERATURE) میں اس موضوع پر کچھ بحث کی گئی ہے جو بلاشبہ محققانہ ہے لیکن اس کتاب میں بھی اس سوال کا کوئی جواب موجود نہیں کہ اردو میں خواتین کا اولین ناول کون ہے؟

۲۲ر دسمبر ۶۷ء کے "ہماری زبان" میں یہ سوال بیگم نسیم اقتدار علی نے قارئین کے سامنے پیش کیا اور ۲۲ر جنوری ۶۸ء کے ہماری زبان میں سید سلیمان حسین نے اس کے جواب میں یہ اطلاع دی کہ ان کے علم کے مطابق بہار کی بیگم رشید النساء اہلیہ مولوی یحییٰ علی صاحب کا سماجی و اصلاحی ناول "اصلاح النساء" اردو میں خواتین کا اولین ناول ہے۔ سید سلیمان حسین صاحب کے اس خیال کی تائید و تصدیق پروفیسر شاہ مقبول احمد، صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج، کلکتہ نے یکم مارچ ۶۸ء کے ہماری زبان میں کی اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:-

> "ناول اصلاح النساء مصنفہ رشیدۃ النساء کا زمانۂ تصنیف ۱۸۸۱ء ہے۔ ناول زیر بحث کی بابت تفصیلات میں نے اپنی کتاب 'چند ادبی مسائل' اور ڈاکٹر اختر اورینوی نے اپنی کتاب 'قدر و نظر' میں درج کر دی ہیں۔"

میرے پیش نظر ہماری زبان کے متذکرہ بالا تینوں شمارے ہیں۔ بیگم نسیم اقتدار علی کے استفسار سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وہ لکھنؤ یونی ورسٹی سے اردو میں ناول نگار خواتین کے موضوع پر ریسرچ کر رہی ہیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے۔ ان کے سوال کے جواب میں جو مراسلے "ہماری زبان" میں اب تک شائع ہوئے ہیں ان کو پڑھ کر یقیناً انھیں "اصلاح النساء" اور اس کی مصنفہ کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی اور ساتھ ہی ان مراسلوں کی اشاعت سے قارئین "ہماری زبان" بھی اس مسئلہ سے دلچسپی لے رہے ہوں گے اور پوری واقفیت حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوں گے چنانچہ ان ہی باتوں کے پیش نظر میں ذیل میں "اصلاح النساء" اور اس کی مصنفہ رشیدۃ النساء کا تعارف پیش کر رہا ہوں لیکن اس سے قبل سید سلیمان حسین اور شاہ مقبول احمد صاحبان کے مراسلات میں جو باتیں محل نظر ہیں ان کی نشان دہی مناسب معلوم ہوتی ہے۔

سید سلیمان حسین صاحب نے اصلاح النساء کی مصنفہ کا نام بیگم رشید النساء لکھا ہے جب کہ صحیح نام رشیدۃ النساء ہے۔

شاہ مقبول احمد صاحب نے یہ اطلاع دی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب "چند ادبی مسائل" اور اختر اورینوی نے اپنی کتاب "قدر و نظر" میں اس ناول کی بابت تفصیلات فراہم کی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے مجموعۂ مقالات "چند ادبی مسائل" کے ایک مقالہ بہ عنوان "بہار کی ماحول اور اردو ادب" میں اس کتاب کا ذکر موجود ہے لیکن صرف اسی قدر کہ:-

> "...... اس طرح ماحول اور زبان کے اعتبار سے "اصلاح النساء" (از رشیدۃ النساء، ۱۸۸۱ء) ایک قابل قدر ناول ہے۔ اس میں بھی مقامی ماحول رسم و رواج کی عکاسی ملتی ہے۔ قصہ لکھتے وقت مصنفہ کے پیش نظر اپنے ہی گرد و نواح کے حالات تھے۔ اصلاح غرض تھی مگر غیر ارادی طور پر مصنفہ کی گردش قلم سے ایسے نقوش ابھرے ہیں جن میں اس خطۂ ملک کے معاشرے کے آب و رنگ دکھائی دیتے ہیں جہاں اس کے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں ......"
>
> (چند ادبی مسائل صفحہ ۱۳۴ تا ۱۳۵)

اس مختصر سی تحریر کو اصلاح النساء کے متعلق "تفصیلات" کہنا ہرگز مناسب نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اختر اورینوی کے مجموعۂ مقالات "قدر و نظر" میں اس کتاب کے متعلق کسی قسم کی کوئی تحریر موجود نہیں ہے۔ غالباً شاہ مقبول احمد صاحب نے سہواً اس کتاب کا نام لکھ دیا ہے اس لئے کہ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہے کہ اختر صاحب نے اصلاح النساء کے متعلق کچھ تفصیلات اپنے مقالہ "بہار میں اردو ناول نگاری" میں فراہم کی ہیں لیکن ان کا یہ مقالہ "قدر و نظر" میں نہیں بلکہ ان کے ایک دوسرے مجموعۂ مقالات "تحقیق و تنقید" میں شامل ہے۔ انھوں نے اپنے مقالہ میں بہت ہی واضح الفاظ میں تحریر کیا ہے کہ

> "یہ خاتون غالباً سب سے پہلی ناول نگار خاتون ہیں یعنی بیگم مولوی یحییٰ علی صاحب رشیدۃ النساء۔ آپ نے "اصلاح النساء" ایک سماجی اصلاحی ناول لکھی۔"
>
> (تحقیق و تنقید صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۰)

اختر صاحب نے اپنے مقالہ میں جو مزید تفصیلات فراہم کی ہیں وہ درج ذیل ہیں:-

> "........... اندرونی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ (یعنی اصلاح النساء) مراۃ العروس کے بعد لکھی گئی۔ اللہ مولوی نذیر احمد صاحب کو عاقبت میں بھی بڑا انعام دے! ان کی کتاب کے پڑھنے سے عورتوں کو بڑا فائدہ پہونچا۔ جہاں تک ان کو معلوم تھا انھوں نے لکھا اور اب ہم جو

جاتے ہیں اس کو انشاء اللہ تعالیٰ لکھیں گے۔ جب اس کتاب کو لڑکیاں پڑھیں گی تو مجھے خدا سے امید ہے کہ انشاءاللہ سب "اصغری" ہو جائیں گی۔ شاید سو میں ایک آدھ بدقسمتی سے "اکبری" رہ جائے تو رہ جائے۔ میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہوگی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہوگا اور دیکھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کو جیسا ٹھیک لکھا ہے آنکھ دیکھی بات لکھی ہے۔ کردار، واقعات اور فضا سب اپنے اندر مقامی رنگ رکھتے ہیں۔ بسم اللہ اور اشرف النساء اہم ترین سیرتیں ہیں ..... "

(تحقیق و تنقید ص ۱۸۳ تا ۱۸۵)

اصلاح النساء کے متعلق اختر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ آج بھی صحیح اور درست ہے۔ مزید تفصیلات ذیل میں درج کی جاتی ہیں:۔

"اصلاح النساء" کی مصنفہ کا نام رشیدۃ النساء ہے (یہ بات دوسروں کو اُن کے خاندان کے افراد سے دریافت کرنے پر معلوم ہوئی۔ اس لیے کہ کتاب میں انھوں نے اس دور کے رواج کے مطابق اپنے نام کا اعلان نہیں کیا ہے) ان کا تعلق صوبہ بہار کے ایک اعلیٰ خاندان سے تھا۔ اصلاح النساء کی اشاعت اوّل کے دیباچہ اور اشاعت دوم کے سرورق پر انھوں نے اپنا تعارف ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"والدۂ محمد سلیمان سلمہ الرحمٰن بیرسٹر ایٹ لا دختر شمس العلماء مولوی سید وحید الدین خان بہادر مرحوم و مغفور و ہمشیرہ شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب و آنریبل نفضل امام خان بہادر۔"

اس اعتبار سے یہ صاحب کاشف الحقائق امداد امام اثر کی بہن اور ہندوستان کے مشہور قانون داں سر علی امام مرحوم اور حسن امام مرحوم کی پھوپھی ہوئیں۔ (مزید تفصیلات کے لیے لیڈی انیس امام صاحبہ پٹنہ سے رجوع کیا جاسکتا ہے)

اصلاح النساء کی دو اشاعتیں میری نظر سے گذری ہیں۔ پہلی اشاعت ۱۸۹۴ء میں منظر عام پر آئی جو (۱۸ × ۲۲ س م) کے ۱۷۱ صفحات پر مشتمل ہے اور صرف ایک حصہ میں ہے۔ دوسری اشاعت میں پہلے حصے کے علاوہ کتاب کا دوسرا حصہ بھی ہے جو ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ سائز پہلی اشاعت کے مطابق ہے اور سنہ طبع درج نہیں ہے۔ اشاعت اوّل کے سرورق کی تحریر درج ذیل ہے:۔

اصلاح النساء

از تصنیفات

والدہ مسٹر محمد سلیمان سلمہ الرحمٰن، بیرسٹر ایٹ لا دختر شمس العلماء مولوی سید وحید الدین خان بہادر مرحوم و مغفور و ہمشیرہ شمس العلماء مولوی سید امداد امام صاحب و آنریبل مسٹر نفضل امام خان بہادر

حسب فرمائش جناب مسٹر محمد سلیمان بیرسٹر ایٹ لا فرزند با وقار مصنفہ باہتمام خواجہ محمد خلیل الدین در مطبع قیصری واقع پٹنہ طبع گردید .... بار اوّل ...."

کتاب کی پشت پر مصنفہ کی مہر "والدۂ محمد سلیمان" ثبت ہے۔ دوسری اشاعت کے سرورق پر مندرجہ بالا عبارت کے علاوہ یہ شعر بھی درج ہے ؎

عروج علم کا سکہ جہاں میں آج جاری ہے
یہ زیور سب سے بہتر ہے یہ دولت سب سے بھاری ہے

اصلاح النساء کے سال تصنیف اور سنہ طبع و اشاعت کا پتہ دیباچہ کی عبارت سے چلتا ہے۔ اشاعت اوّل کے دیباچہ کے آخر میں یہ تاریخ درج ہے:۔

"۲۳ر جون ۱۸۹۴ء　　۱۸ر شہر ذی الحجہ ۱۳۱۱ ہجری"

اصلاح النساء کا سنہ تصنیف ۱۸۸۱ء ہے جو دیباچہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہوتا ہے:۔

"محمد سلیمان سلمہ الرحمٰن کے عمدہ تعلیم پانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تیرہ برس سے یہ کتاب جو ردی میں پڑی تھی اس کو انھوں نے چھپوادیا۔ اللہ تعالیٰ برخوردار موصوف کی ہر طرح کی ترقی فرمائے۔"

(دیباچہ اصلاح النساء، اشاعت اوّل)

اصلاح النساء کا موضوع اور مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ مصنفہ نے دیباچہ میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ چند عورتوں نے مسلم گھرانوں میں عورتوں کی جہالت اور بے ہودہ رسوم کا ذکر ان سے کیا اور جب انھوں نے ان باتوں کا تجزیہ منطقی انداز میں کیا تو لوگوں نے بہت تعریف کی اور ان سے فرمائش کی کہ ان باتوں کو نصیحت کے طور پر لکھ ڈالیں چنانچہ:۔

"ان کے کہنے سے ہم کو بھی خیال ہوا کہ ایک کتاب ایسی لکھیں جس میں ان رسموں کا بیان ہو جن کے باعث سے (کذا) صدہا گھر تباہ ہوگئے اور جو باعث فضول خرچ اور فساد کے ہیں مگر مجھے یہ خیال بھی ہوا کہ ان باتوں کو نصیحت کے طور پر لکھنا میری حیثیت پر زیبا نہیں ہے بلکہ ان باتوں کو قصہ کے پیرایہ میں لکھنا ہر طرح سے مناسب ہوگا۔ یہ سوچ کر میں نے ان ہی رسموں اور جھگڑوں کو جو روزانہ ہر شریف خاندان میں ہوتے ہیں فرضی نام رکھ کر لکھنا شروع کیا ......"

(دیباچہ اصلاح النساء)

مزید یہ کہ:۔

"چونکہ اس کتاب میں عورتوں ہی کی اصلاح مقصود ہے اس لیے اس کا نام اصلاح النساء رکھا گیا۔"

(دیباچہ اصلاح النساء)

(باقی آئندہ)

سید علی کاظمی

جمال الدین، ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر اقبال اور قاضی عبدالغفار

سید جمال الدین پر قاضی محمد عبدالغفار کی سوانحی تصنیف "آثار جمال الدین" اب تک اردو زبان میں جمال الدین پر لکھی گئی پہلی اور آخری کتاب ہے جسے کچھ خامیوں کے باوجود بڑی حد تک سراہا جا سکتا ہے جس زمانے میں قاضی عبدالغفار نے "آثار جمال الدین" مرتب فرمائی اس زمانے کے علمی و تحقیقی وسائل و ذرائع کو نظر میں رکھتے ہوئے قاضی صاحب کی یہ کوشش بہرحال قابل ستائش ہے۔ قاضی صاحب نے اس سلسلے میں حتی الامکان بڑی چھان بین سے کام لیا ہے اور اپنے غیر ممالک کے سفر کے دوران بھی اس بات کا خیال رکھا کہ جمال الدین پر جہاں اور جن مستند وسائل سے مواد مل سکے اسے حاصل کر لیا جائے۔

جس محنت اور محبت کے ساتھ قاضی صاحب نے یہ سوانح مرتب فرمائی اس کے پیش نظر ہر صاحب نظر کے لیے یہ خیال کرنا آسان ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک ضروری سا ہو جاتا ہے کہ وہ جمال الدین کی خدمات، ان کی سیاسی پالیسی ان کے مذہبی معتقدات و نظریات پر گہری نظر رکھتے ہوں گے۔

قاضی صاحب نے ۱۹۱۲ء میں سیاست و صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ اس کے بعد سے وہ برابر ایسے لوگوں اور ایسے معاملات سے دوچار رہے جو اپنے وقت کے نمائندہ لوگ تھے اور وہ معاملات و مسائل بھی اہم تھے جو ان لوگوں کے بیچ رہ کر پیش آتے تھے۔ اس وجہ سے کوئی عام فہم انسان بھی جس کی نظر میں قاضی عبدالغفار کی گذشتہ زندگی رہی ہے یہ نہیں سمجھ سکتا کہ قاضی صاحب ابوالکلام آزاد کی سیاسی، صحافتی اور مذہبی خدمات یا ان کے نقاط نظر اور لائحۂ عمل سے بے بہرہ رہے ہوں گے۔

اب رہے ڈاکٹر اقبال! سو قاضی صاحب ایک محقق، معیاری اور کامیاب صحافی ہی نہیں تھے بلکہ ایک نامور ادیب بھی تھے۔ ان کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ ادبی و شعری ذوق صاف ستھرا ہی نہیں بلکہ معیاری بھی تھا۔ اور اکثر انھوں نے ڈاکٹر اقبال پر مقالے لکھے ہیں جو یوم اقبال کے جلسوں میں پڑھے گئے ہیں۔ اس بنا پر یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ قاضی صاحب جیسا نامور ادیب اور کامیاب صحافی ڈاکٹر اقبال کے سیاسی نظریات ان کی ادبی خدمات اور مذہبی معتقدات کے بارے میں صحیح عرفان اور بھرپور معلومات نہیں رکھتا ہوگا۔

اس صورت حال کے پیش نظر ایک غیر جانب دار ادیب اور ادیب کا بہر حال غیر جانب دار ہونا ضروری ہے کہ جو بغیر مصلحت وقت کا نہیں بلکہ حقیقت کا پرستار بھی ہو مذکورہ بالا ہستیوں کے بارے میں جب کچھ لکھے گا تو نام پڑھنے والے پر لازم آتا ہے کہ وہ اس کے بیان اور اس کی رائے کو نسبتاً زیادہ صحیح مستند اور قابل اعتماد سمجھے اور اس کے لکھنے پر بھروسہ کرے۔ لیکن اسے کیا کہیے کہ ان حضرات کے سلسلے میں قاضی صاحب کے بیان خود اپنی رائے میں وہ یکسانیت نہیں تھی جس کی ان سے توقع کی جا سکتی ہے۔ بلکہ قابل ذکر حد تک تضاد ملتا ہے۔ بظاہر اس تضاد کی وجہ وقت کی سیاسی گردش اور مصلحت کے مطابق اپنے نظریات و خیالات کو ہم آہنگ کر لینے کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے!

٭ مقالات جمال الدین، افغانی مرتبہ صلاح الدین رفعت کے مقدمے میں ۱۹۴۴ء میں قاضی صاحب نے لکھا تھا۔

شاہ الرحمن خان نشاط

تضمین بر کلام اقبال

ندرتِ فکر و عمل سے زندگی کی آب و تاب
ندرتِ فکر و عمل کی برکتیں ہیں بے حساب
ندرتِ فکر و عمل ہے اک متاعِ لاجواب
"ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شے ہے ملت کا شباب"

اس کے باعث ہوتی ہے تعمیر و تزئینِ خودی
اس سے ہوتا ہے نمایاں جوہرِ خود آگہی
اس کا اک ہلکا سا پرتو مشعلِ صد روشنی
"ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارا لعلِ ناب"

تیرا ہر پیر و جواں تھا عیش و مستی کا اسیر
عشرتِ امروز کا شیدا تھا تیرا ہر امیر
آج کیسا آ گیا ہے انقلابِ بے نظیر
"روحِ ملتِ الکبریٰ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب"

آج ہر دل میں ہے کیف و شادمانی کا فروغ
جد و جہدِ زیست میں ہے کامرانی کا فروغ
رونما ہے بچہ بچہ میں جوانی کا فروغ
"چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب"

ندرتِ فکر و عمل سے کھل گیا رازِ وجود
ختم ہوتا جا رہا ہے زندگانی کا جمود
باز ہو کر ہی رہے سب عقدہ ہائے ناکشود
"یہ محبت کی حرارت یہ تمنا یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب"

"........ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد آج سے ساٹھ سال قبل، پہلے شخص سید جمال الدین افغانی تھے جنھوں نے فلسفۂ خودی کو ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا...... ہندوستان میں شیخ کے تصورات کی اس روح کا دامن نصف صدی بعد علامہ اقبال کی فکر فلک پیما نے پکڑا۔"

قاضی صاحب کی اس رائے پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا سلیم احمد سلیم مینائی بنگلوری نے الجمعیۃ کے مولانا آزاد نمبر مورخہ ۴ر دسمبر ۱۹۵۸ء میں اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ

"..... قاضی مرحوم نے در اصل اس سلسلے کی ایک اہم کڑی درمیان سے نکال دی ہے۔ حالانکہ بقول شیخ اکرام علامہ اقبال کا فلسفۂ خودی "الہلال" ہی کی صدائے بازگشت ہے...... مشرق کی آزادی و بیداری کا وہ آئینہ ہے جس میں افغانی اور مولانا آزاد دونوں ہم شکل نظر آتے ہیں۔"

"تذکرہ ابوالکلام آزاد" کے دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد نے لکھا ہے کہ اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔ قیاس غالب ہے کہ اسی بات کو شیخ اکرام بھی لے اڑے ہیں جس کا حوالہ مولانا سلیم احمد نے اپنے مذکورہ بالا اعتراض میں دیا ہے۔
اس سلسلے میں ڈاکٹر اقبال نے خاصی وضاحت کے ساتھ لیکن نہایت شکایت آمیز انداز میں اپنے ایک مکتوب مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۱۹ء میں سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا۔

"..... مولانا ابوالکلام آزاد کا "تذکرہ" آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچہ میں فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں...... اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا۔ تحریک الہلال ہی نے اسے مسلمان کیا...."

اس سلسلے میں اگر خود مولانا ابوالکلام آزاد کی رائے کا اقتباس بھی پیش کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ موصوف "مقام جمال الدین افغانی" مرتبہ مبارز الدین رفعت (مطبوعہ ۱۹۴۹ء نفیس اکیڈمی کراچی ص۱) میں رقمطراز ہیں۔

"...... ہندوستان میں تو الہلال کی اشاعت سے پہلے غالباً لوگ سید جمال الدین کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ ۱۸۷۹ء میں جب وہ حیدر آباد اور کلکتہ میں مقیم تھا تو ہندوستانی مسلمانوں میں سے صرف ایک شخص یعنی مرحوم عبدالغفور شہباز (مصنف حیات نظیر اکبرآبادی) تھا جسے اس کے فضل و کمال کی تھوڑی سی شناخت نصیب ہوئی تھی۔ اور اس کے چند فارسی مقالات کا ترجمہ شائع کیا تھا......"

بہرحال اس سلسلے میں تو بحث کی بڑی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے کہ اقبال اور ابوالکلام آزاد میں سے ہندوستان میں جمال الدین کے خیالات و نظریات کا پہلا مبلغ و نمائندہ کسے قرار دیا جائے یہاں تو عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ۱۹۴۴ء میں قاضی عبدالغفار جیسی ذاکر اور علامہ اقبال کی فکر فلک پیما کے اتنے معتقد مداح اور قائل تھے اور جسے ہندوستان میں جمال الدین کے فلسفۂ خودی کا واحد مبلغ تسلیم فرماتے تھے، چند ہی سال بعد اسی اقبال کے بارے میں اور انھیں مولانا ابوالکلام آزاد کے مقابلے میں جنھیں بقول سلیم احمد سلیم قاضی صاحب نے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تھی، ان کی رائے کیا ہو گئی تھی، وہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔ قاضی صاحب لکھتے ہیں۔

"........ اقبال رموز خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لیے پیش کرتے ہیں، اسی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں اور اسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں۔ مگر مولانا کا فلسفہ حیات اقبال کے تصورات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے...... اقبال صرف مسلمانوں کے لیے قوت عمل کا ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اس قوت نمو کا ذکر کرتے ہیں جو اس میں ودیعت ہے..... اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے تصور سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصور سے۔ اقبال کے پیام کی روح انسانیت کے وسیع تر پھیلاؤ میں نہ پھیل سکی۔ اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لیے فرقہ پرستی کا ایک فتنہ انگیز کھلونا بن گیا........"

(آثار ابوالکلام آزاد مرتبہ قاضی عبدالغفار ص ۴۴)

یہاں قاضی صاحب نے جو کچھ اقبال کے بارے میں لکھا ہے اسے حرف بہ حرف صحیح مان لینے کے بعد بھی یہ بات ذہن سے نہیں نکلتی کہ پہلی رائے کے صرف چار سال بعد، بے سرو سامانی کے عالم میں حیدرآباد چھوڑنے اور تقسیم وطن سے پہلے قاضی صاحب کی کسی تحریر یا تقریر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی اس ہمہ گیر انسانیت اور عظمت کا ذکر یا اعتراف نہیں ملتا۔ بلکہ اسی تنگ نظر اقبال کا ذکر بار بار ملتا ہے جس کے پیام کی روح انسانیت کے وسیع تر پھیلاؤ میں نہ پھیل سکی!

انیس انور

مکتوب لندن

انگریزی نہیں، اردو!

روزانہ صبح سات اور نو بجے بی بی سی ریڈیو سے "ٹوڈے TODAY" نشر ہوتا ہے گذشتہ ہفتہ مڈلینڈ کی ایک بیکری کے فورمین کا انٹرویو نشر ہوا۔ اس بیکری میں اردو داں ملازمین خاصی تعداد میں ہیں۔ فورمین نے انٹرویو میں انکشاف کیا کہ اردو داں ملازمین کو انگریزی سکھانے کی ناکام کوشش کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب بہتر یہی ہے کہ وہ خود اردو سیکھیں۔ چنانچہ غریب فورمین کو اردو سیکھنی پڑی اور اب وہ "آپ کا کام بہت اچھا ہے۔ آپ کا کام بُرا ہے" وغیرہ آسانی سے بول سکتے ہیں۔ دورانِ انٹرویو فورمین نے اردو کے چند جملے خوب چٹخارے لیتے ہوئے دہرائے۔ اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ انہیں دلیلوں میں اردو کی یہ مقبولیت بہت جلد اسے ایک عالمگیر زبان کا درجہ دلا دے گی۔ میری مراد اس زبان کے وسیع استعمال، رواج اور ضرورت سے ہے جو بیشتر ممالک کے سیاسی و معاشی حالات اور مہاجرین و تارکین وطن کی موجودگی اس زبان کو فراہم کرنے کا موقع فراہم کر رہی ہے۔

بی بی سی سے انگریزی سکھانے کی کوششیں اپنی جگہ بڑی مبارک ہیں لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ اب بی بی سی والے وقت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے انگریزوں کو اردو سکھانے کا بھی ایک پروگرام شروع کر دیں۔ آخر ہم بھی تو ۲۰۰ برس تک ان کی زبان سیکھتے رہے تو ہم گوروں کو بڑی تعداد میں اردو سیکھنے پر مجبور نہ کر سکے مگر اب تو ان کی باری ہے۔

کینیا کے اردو شاعر و ادیب لندن میں

کینیا کے مشہور ادیب اور شاعر ایس۔ اے۔ مہدی ان دنوں لندن میں ہیں۔ اردو اور انگریزی کے شعراء کے خیالات میں ہم آہنگی کے موضوع پر ان کی انگریزی کتاب آج سے دو سال قبل برطانوی ہائی کمشنر مقیم کینیا نے بطور خاص ملکہ برطانیہ اور برٹش میوزیم کو بھجوائی تھی۔ اب یہاں کے بیشتر اداروں میں یہ کتاب موجود ہے۔ کچھ عرصہ پیشتر ان کا شعری مجموعہ "کفِ گل فروش" شائع ہوا تھا تو اس وقت ہند و پاکستان کے اردو جرائد نے اسے اردو شاعری میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا تھا۔ مہدی صاحب ہند و پاکستان کا دورہ ختم کر کے حال ہی میں لندن پہنچے ہیں اور یہاں کے اردو نواز حلقوں سے رابطہ پیدا کرنے کے متمنی ہیں۔ اس وقت وہ ساؤتھ ویسٹ ۱۸ لندن میں فروکش ہیں۔

اردو کتب کا حصول

آسٹن انڈر لائن، لنکا شائر کی مقامی لائبریری کے منتظمین نے اردو داں طبقے کے ذوق کی تسکین کے لئے اردو زبان کی کتابیں حاصل کی ہیں جو مستقبل قریب میں مطالعہ کے لئے دستیاب ہو سکیں گی۔ اس امر کی اطلاع دیتے ہوئے عبدالرشید صاحب نے متعلقہ علاقوں کے اردو داں طبقے سے لائبریری کی نئی سہولتوں سے زیادہ سے زیادہ تعداد میں مستفید ہونے کی درخواست کی ہے۔

کتابیں ملیں

(تبصرے کے لئے ہر کتاب کی دو جلدیں آنا ضروری ہیں)

لیل و نہار

مصنف: اشفاق الایمان

ناشر: ساتھی اکیڈمی، کلکتہ

صفحات: ۱۹۲۔ قیمت تین روپے

جادۂ منزل

مصنف: پرکاش ناتھ پرویز

ناشر: مکتبہ نگارش، امرتسر

صفحات: ۱۱۲ قیمت، ایک روپیہ

مجبوری کا دوسرا نام کیا ہے

مصنف: مانک ٹی شاہ

ناشر: سنسار پبلشنگ ہاؤس بمبئی

صفحات: ۱۰۲ قیمت: دو روپے

فردوس خیال۔ (مجموعہ رباعیات)

مصنف: عابد مینائی شاہجہانپوری

ناشر: ادبی دنیا، دلی

صفحات: ۱۲۸ قیمت: دو روپے

سیاسی اصطلاحوں کی فرہنگ

مترجم: گوپال متل

ناشر: نیشنل اکاڈمی، دہلی

صفحات: ۱۲۵ قیمت: ایک روپیہ

انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

مراسلہ

مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں

مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک شخصیت تھی۔ قد آور و گراں قدر!! لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد آج ہم اس قد آور و گراں قدر شخصیت کو بھلا بیٹھے ہیں۔ غالباً "ہماری زبان" نے بھی اپنے کسی پچھلے شمارہ میں اس ناقابل معافی بھول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ "جامعہ" دہلی کے ایڈیٹر جناب فاروقی صاحب اپنے "اداری نوٹ" "شذرات" میں اور جناب عبداللطیف صاحب اعظمی "رپورتاژ" میں مولانا محترم کی "غریب الدیاری" پر اشکبار ہیں۔ علاوہ ازیں ۲۲ر فروری کو دہلی میں جو جلسہ مسز اندرا گاندھی کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا اس میں انھوں نے خود سیاسی و سماجی معاملات میں مولانا کے اصولوں کو بھول جانے کا اعتراف کیا ہے خود انھی کے الفاظ میں۔

"ہم نے مولانا اور ان کی باتوں کو بھلا دیا جبھی ملک کی یہ حالت ہے۔"

مجھے محترمہ کے اس خیال کے بارے میں کچھ کہنا نہیں ہے۔ اور میں علمائے دین کی طرف سے جو سرد مہری اختیار کی گئی ہے اس کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہوں گا۔ مولانائے محترم نے دین میں اجتہاد کی جن راہوں کو استوار کیا ہے اور جو فکر و قیاس کی نئی جوت جگائی ہے شاید اس کی اہمیت کو سمجھنے کے ہم اہل نہیں ہیں۔ البتہ مجھے صرف اس قدر کہنا ہے کہ مولانا نے "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعہ اور اپنے بے شمار مضامین اور تقاریر سے ادب کے خزانہ کو مالا مال کیا، نئی قدروں، روشن اصولوں کو طرح دی اور ادب کو الفاظ اور حسن کے ذریعہ آراستہ کیا، نیا آہنگ اور نئی آواز دی اور اردو زبان و ادب کی جو آج صورت حال ہے اس کے نکھار اور سنوار میں جو انھوں نے کارہائے انجام دئے کم از کم ہم ان کے ان ہی کارناموں کا اعتراف کریں، خراج تحسین ادا کریں! ورنہ واقعتاً یہ ہماری احسان ناشناسی ہوگی! یہ کتنے دکھ کی بات ہے اور کبھی ہم سوچتے بھی نہیں کہ ہم مولانا کو بھول کر کیا کھو رہے ہیں؟ مولانا زندگی ہی میں شہرت اور عزت کی چاہ سے بے نیاز تھے۔ وہ عالم تھے، ادیب تھے، واعظ تھے، محتسب تھے اور سیاسی تھے، مدبر تھے اس کے باوجود انھوں نے تقدس کا لبادہ اوڑھ کر مسند ارشاد کا دعویٰ نہیں کیا۔ انھوں نے ملک کے نامور ادیب بن کر اپنے جشن کا اہتمام نہیں کیا اور نہ ہی سیاسی اکھاڑے میں کبھی بڑی کرسی کی خواہش کی۔ آج اگر ہم ان کی یاد منائیں گے، جشن کا اہتمام ہوگا، سیمینار و سمپوزیم ہوگا یا پھر اکیڈمی قائم کی جائے گی تو اس سے ان کی ذات کو کیا فائدہ پہنچنے والا ہے۔ ذات تو فانی ہے فنا ہوگئی لیکن ذات باقی بھی رہتی ہے اس شکل کہ اس کے اچھے اور برے دو ہی اعمال باقی رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مولانا کی ذات برائیوں سے پاک تھی ہم تو ان برائیوں سے سبق بھی سیکھ سکتے ہیں، خود اپنی زندگی میں ان برائیوں سے بچ کر اچھی مثال قائم کر سکتے ہیں، ہم مولانا کی زندگی کی تکمیل ہو سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگ وہاں کھڑے ہیں جہاں سے مولانا کی قد آور شخصیت کا سایہ بھی شروع نہیں ہوتا، اس لئے ان کی برائیوں پر انگلی رکھنا ہمیں زیب بھی نہیں دیتا! اس وقت ان کی اچھائیوں کو اپنانے اور نیکیوں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ ادب کے ذریعہ جن افکار و اذکار کو انھوں نے پھیلانے کی کوشش کی انہی افکار و اذکار کو عام کرنا ہے تاکہ ملک و قوم اس راہ پر چل پڑے کہ جس کے ذریعہ امن اور سلامتی، بھائی چارگی اور ایکتا کی منزل حاصل ہوتی ہے۔ اس سے ادب کا مقصد بھی پورا ہوگا اور ادب صحت مند رجحانات کا نقیب و آئینہ دار بھی ہوگا۔

بہرحال یہ کام انفرادی کوششوں سے ہونے کا نہیں ہے اور نہ ہی ابھی انجمن اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے جو معنوی اور ظاہری اعتبار سے محدود ہے۔ میری رائے میں مرکزی انجمن ترقی اردو ہند اگر اس کام کا بیڑہ اٹھائے تو بہت ممکن ہے کوئی نتیجہ بھی نکلے۔ مرکزی انجمن کی طرف سے خود علی گڑھ یا دہلی میں بڑی کانفرنس بلائی جا سکتی ہے اور پھر ہند گیر پیمانہ پر سالانہ جشن یوم آزاد کے ذریعہ یہ کام انجام دے سکتی ہیں۔ مختلف ماہ ناموں خاص نمبروں کے ذریعہ اور اخبارات کے مسلسل کالموں کی مدد سے مضامین شائع کر کے مولانا کے خیالات کو عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ قوم مختلف مسائل سے دوچار ہے اور ان مسائل میں ایکتائی اور اتحاد کا مسئلہ بڑی سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔ ایسی کوئی راہ نہیں ہے سوائے مولانا مرحوم کی راہ کے کہ جس کے ذریعہ ہم امن کو عام کر سکیں گے۔ ہمارا ادب ہماری بے خیالی کا آئینہ بن گیا ہے۔ ادب مقصد سے خالی ہے آج ہمیں کوئی نعرہ سنائی نہیں دیتا کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ جدیدیت کو میں نری مخالفت کیوں ایسا نہیں ہے یا ادب لغو بھی نہیں ہے۔ بہرحال ایک ایسی منزل آئی ہے جب ہم تنہائی اور غم محسوس کرتے ہیں۔ ایسے وقت ضرورت ہے کہ ہمارے ادب کا دانشور طبقہ آگے بڑھے، سنبھالا دے اور بے مقصد ادب کو مقصدیت سے ہم آغوش کرے۔ اس سلسلہ میں بھی مولانائے محترم کے مقاصد اور خیالات ہماری رہبری کر سکتے ہیں۔ یہ اچھا وقت ہے کہ ہم مولانا کے غیر مذہبی (جو مذہبی شعور ہی کا نتیجہ ہیں) اور امن پسند رجحانات کو عام کریں۔

طیب انصاری
(استاد شعبۂ اردو گلبرگہ کالج)

انجمن ترقی اردو بہار کی ساتویں ریاستی اردو کانفرنس کی روداد

ایوب نگر (انجمن اسلامیہ ہال) مراد پور، پٹنہ میں اجلاس مندوبین کی پہلی نشست جناب غلام سرور، صدر بہار ریاستی انجمن ترقی اردو کے زیر صدارت منعقد ہوئی۔ اس موقع پر صدر جلسہ کی خواہش کے مطابق بہار کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مندوبین نے ریاستی انجمن کے تنظیمی و تحریکی مسائل پر کھل کر بحث کی۔

۵ بجے شام تک انجمن اسلامیہ ہال کے اندرونی و بیرونی احاطے میں شامیانوں تلے ایک چھوٹی سی خوب صورت بستی بس گئی، ایوب نگر روشنیوں کا ایک شہر بن گیا، بابائے اردو مولوی عبد الحق، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، شاد عظیم آبادی، کانپور کے قتیل اردو یادگار کے ناموں سے رنگ برنگ کے دروازے مہمانوں کا استقبال کرنے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ۵ بجے افتتاحی اجلاس کے صدر، جناب شیو پرشاد سنہا (سابق جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ حال سینیر ایڈوکیٹ، سپریم کورٹ) تشریف لے آئے۔ پروفیسر عبد المغنی جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ نے اجلاس کے آغاز کی تمہید باندھی، جناب غلام سرور نے صدارت کی تحریک کی، جناب مولانا عتاب صدیقی (جنرل سکریٹری بہار ریاستی انجمن ترقی اردو) نے تائید کی۔ جناب شیو پرشاد سنہا پھولوں کا ہار پہن کر مسند صدارت پر جلوہ افروز ہوگئے۔ اجلاس کی باضابطہ کارروائی شروع ہوگئی۔ سب سے پہلے جناب شاہ مشتاق احمد سابق ایم ایل اے، صدر مجلس استقبالیہ نے اپنا خطبہ پڑھا، مہمانوں کا خیر مقدم کیا، اردو تحریک کے ماضی اور عظیم آباد کی تاریخی حیثیت کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے تحریک کے مستقبل کی طرف واضح اشارے کئے۔ اس کے بعد پروفیسر عبد المغنی جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ نے اپنی رپورٹ پڑھنی شروع کی وہ کچھ دیر تک ہندوستان اور بہار میں اردو تحریک کے مسائل کا تجزیہ کرتے رہے اور ہزاروں ہزار کا مجمع ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ موصوف نے لسانی و ادبی اور سماجی و سیاسی پہلوؤں سے ملک اور ریاست میں اردو کی حیثیت و اہمیت واضح کرتے ہوئے آزاد ہندوستان کے لسانی مسئلے کا بھرپور جائزہ لیا اور اردو کے مسئلے کو ایک کل ہند سیاسی پس منظر میں رکھ کر اس کی تمام پیچیدگیوں کا تجزیہ کیا۔ اس جائزے اور تجزیے کی روشنی میں انھوں نے اہل اردو کو آئینی و جمہوری اور عملی اعتبار سے مرکز سے شمالی ہند کی ریاستوں تک اردو کے لیے قومی و سرکاری سطح پر دوسری زبانوں کے مساوی درجے کا مطالبہ کیا جائے، یہی اردو والوں کی منزل ہونی چاہیے، خواہ اس تک پہنچنے میں کتنی ہی دیر ہو جائے اور کیسی ہی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ موصوف نے علمی و ادبی اور تعلیمی و صحافتی سطح پر اردو کے اندرونی استحکام کی ضرورت پر بھی روشنی ڈالی۔ رپورٹ ختم ہوئی۔ جناب رامانند سنگھ (چیرمین کاروڈ بلاک بہار) سے درخواست کی گئی کہ صدر اجلاس کے خطبے سے پہلے وہ بھی خصوصی طور پر اسٹیج سے خطاب فرمائیں۔ موصوف نے اپنی گرم جوش تقریر میں ایک طرف اہل اردو کو جہد و جہد اور ایثار و قربانی کی تلقین کی تو دوسری طرف ہندی والوں اور حکومت کے ذمہ داروں کو خبردار کیا کہ اب وہ اردو کی جمہوری تحریک کو دبا نہیں سکتے، انھیں اردو کا حق دینا ہی ہوگا۔ اب صدر اجلاس جناب شیو پرشاد سنہا تالیوں کی گونج میں صدارتی خطبہ ارشاد کرنے کھڑے ہوئے۔ پیرانہ سالی کے باوجود ان کے ایک ایک لفظ سے عزم و جرأت کا اظہار ہو رہا تھا موصوف نے بڑے ہی مبصرانہ و مدبرانہ انداز میں اور نہایت اولوالعزمی اور دلسوزی و دلگیری کے ساتھ اردو کے حقوق اور امکانات کا تذکرہ کیا۔ ان کا لہجہ نرم اور دھیما تھا، مگر اس میں فولاد کی کھنک تھی۔ انھوں نے جنرل سکریٹری مجلس استقبالیہ کی رپورٹ میں پیش کئے ہوئے نکتوں سے اتفاق کیا اور اس کے جرأت مندانہ انداز کو سراہا۔ موصوف نے بہت سی مثالیں دے کر بتایا کہ ارباب اقتدار شعوری طور پر اردو کی حق تلفی کر رہے ہیں اور انھوں نے اردو کشی کا گویا ایک منصوبہ سا بنا رکھا ہے، لیکن اردو کی جڑیں عوام میں پیوستہ ہیں اس کو مٹانا آسان نہیں ہے تمام حق تلفیوں اور ہیچ کی کی ساری کوششوں کے باوجود اردو آج بھی زندہ و توانا ہے اور کل بھی رہے گی، اس لئے کہ اردو ہندوستانی تہذیب کی روح ہے موصوف نے اردو والوں کو تلقین کی کہ وہ ظلم اور جبر کے سامنے جھکیں نہیں پوری ہمت، تدبر اور جوش کے ساتھ اپنی تحریک چلاتے رہیں، اگر ان کا عزم و حوصلہ اور جد و جہد برقرار رہی تو زمانے کو ان کے آگے جھکنا پڑے گا۔

۲۱ر مارچ صبح جناب شیو پرشاد سنہا کی پریس کانفرنس ہوئی جس میں ایک ہینڈ آوٹ تقسیم کیا گیا اور اخباری نمائندوں سے بات چیت ہوئی۔ اس کے بعد مجلس مضامین کا جلسہ شروع ہوا۔ جناب غلام سرور نے صدارت کی۔ ریاستی و مقامی مسائل پر متعدد تجویزیں منظور کی گئیں۔ جناب تقی رحیم (رکن مجلس عاملہ مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی آف بہار) نے اردو کے مطالبے پر خاص اور سرکاری تجویز پیش کی۔ پروفیسر عبد المغنی نے اس میں ایک ترمیم پیش کرتے ہوئے واضح کیا کہ اردو کے حق، صورت حال کی حقیقت اور اہل اردو کے عزائم کو ملحوظ رکھتے ہوئے اب اردو کے لیے مرکزی و ریاستی سطح پر قومی و سرکاری مقاصد کے لیے دوسری قومی زبانوں کے برابر درجے کا مطالبہ کیا جائے۔ موصوف کی اس ترمیم کو قبول کرتے ہوئے، ان کے ساتھ چند اور حضرات پر مشتمل ایک کمیٹی بنادی گئی کہ وہ اجلاس مندوبین کی آئندہ نشست میں ترمیم کے ساتھ مرتب کی ہوئی تجویز کا مسودہ پیش کرے یہ اجلاس شام کو جناب غلام سرور کی صدارت میں شروع ہوا سب سے پہلے پروفیسر عبد المغنی نے ترمیم شدہ تجویز پڑھ کر سنائی جسے حاضرین نے باتفاق آرا منظور کرلیا۔ اس کے بعد انتخاب عہدہ داران کی کارروائی شروع ہوئی۔ جناب محمد حسین انصاری نے صدارت کے لیے جناب غلام سرور کے نام کی تحریک کی۔ جناب غلام سرور نے فوراً اٹھ کر اس عہدے کے لیے پروفیسر عبد المغنی کا نام تجویز کردیا، پروفیسر عبد المغنی نے اپنا نام واپس لیتے ہوئے جناب غلام سرور کی امیدواری کی تائید کی۔ اس کے بعد صدارت کے لیے دو اور نام پیش کئے گئے اور واپس لے لئے گئے۔ جناب غلام سرور بلا مقابلہ صدر منتخب ہوگئے۔ جنرل سکریٹری کے لیے مولانا عتاب صدیقی بھی پروفیسر عبد المغنی وغیرہ کے نام واپس لے لینے کے بعد بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ مرکزی انجمن ترقی اردو کی مجلس عام کے لیے ریاستی نمائندے

کی جگہ پروفیسر عبدالمغنی اور جناب غلام سرور کے نام پیش ہوئے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اپنا نام واپس لے لیا۔ جناب غلام سرور بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔ دوسرے عہدے داروں اور مجلس عاملہ کے ارکان کے انتخاب کے لیے ایک تجویز کے ذریعہ صدر اور سکریٹری کو اختیار دے دیا گیا۔

اس کے بعد اختتامی اجلاس کی کارروائی جناب غلام سرور کی صدارت میں شروع ہوئی۔ سامعین کی کثرت سے حد نگاہ تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے اردو کے مطالبہ پر سرکاری تجویز پڑھ کر سنائی اس کے بعد یکے بعد دیگرے مقررین نے اپنی اپنی تقریروں میں اردو کی اہمیت اور حقوق پر روشنی ڈالی اور ان حقوق کے حصول کے لیے تمام جمہوری و آئینی اقدامات کرنے کا عزم ظاہر کیا۔ جناب مشتاق علی خاں ام ال اے، جناب رام اوتار شاستری، ام پی، جناب خادم حسین ام ال اے، جناب جلیل احمد، ام ال اے، جناب تقی رحیم، جناب رام نندن سنگھ، سکریٹری مارکسسٹ کمیونسٹ پارٹی آف بہار، جناب غضنفر نواب دانش، جناب محمد اعظم، مولانا جمیل اختر، جناب محمد حسین انصاری نے اردو کے مختلف مسائل کا ذکر کیا اور ان مسائل کے حل کے لیے جد و جہد اور ایثار و قربانی سے کام لینے کی تلقین کی۔ جناب خادم حسین نے یہ بھی اعلان کیا کہ جب بھی ریاستی انجمن انھیں ہدایت کرے گی وہ اردو کے لیے اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ سامعین نے ان کے اس اعلان کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ جناب ابراہیم پرویز، جناب شاہ فاروق عطا (اردو محافظ دستہ یوپی)، جناب حسین اعجاز، جناب محمد الیاس (انجمن ترقی اردو مغربی بنگال) نے خاص طور پر اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے ریاستی انجمن کی جد و جہد میں اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ آخر میں صدر اجلاس جناب غلام سرور نے اپنی مختصر و ولولہ انگیز تقریر میں اردو کو اپنا دین و ایمان بتایا اور اس کے حقوق کی بازیافت کے لیے سرفروشی اور جاں سپاری کا عزم ظاہر کیا۔ موصوف نے اہل اردو کو بتایا کہ وہ اب جہاد کے عمل میں قدم رکھ چکے ہیں، لہٰذا اب انھیں ہر قسم کے ایثار و قربانی کے لیے آمادہ ہو جانا چاہیے۔

۱۲ اپریل کو دن میں مولانا تمنا عمادی کی [illegible] اجلاس مندوبین کی آخری نشست منعقد ہوئی، جس میں مقررین نے اردو کے مطالبات و مسائل پر کام کرنے کی عملی تدبیروں اور طریقوں پر روشنی ڈالی۔ اردو محافظ دستہ یوپی کے جناب شاہ فاروق عطا اور جناب ابراہیم پرویز نے مندوبین کو خطاب کرتے ہوئے ان کے سامنے بعض اہم عملی تجویزیں رکھیں جن سے کام کے کچھ نئے گوشے اجاگر ہوئے۔ جناب غلام سرور نے حاضرین کو ایک وسیع نقشہ کار اور طریق عمل سے آگاہ کیا۔

اس کے بعد ایک شاندار مشاعرہ جناب عطا کاکوی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جناب صدر کے علاوہ جن شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا ان میں قابل ذکر حضرات یہ ہیں۔ پروفیسر سید حسن، جناب رضا کریم رضا، پروفیسر انیس امام، جناب کلیم احمد عاجز، جناب ارشد نجمی، جناب کوثر سیوانی، جناب شکیب ایاز، جناب عبدالحمید حمید، جناب ناظم سیوانی، جناب رمز عظیم آبادی، جناب شمس۔ ام۔ ون، جناب خادم نجمی، جناب حسن امام درد، جناب مختار احمد عاصی۔ (ارسال: انجمن ترقی اردو بہار)

شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مقالہ

علی گڑھ ۱۰ اپریل۔ انجمن اردوئے معلیٰ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کا ایک جلسہ پروفیسر آل احمد سرور کی صدارت میں فیکلٹی آف آرٹس لاؤنج میں ہوا جس میں اردو کے مشہور ادیب جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنا مقالہ بہ عنوان شعر کا ابلاغ پڑھا۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا خیر مقدم کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں ان کے مضامین اور تبصروں کو بیشتر لوگوں نے پڑھا ہے اور ان کی جرأت، بے باکی، سنجیدگی اور وسیع مطالعہ کو سراہا ہے۔ ہماری تنقید میں مشرقی روایات کی وجہ سے مروت و طرفداری کا عنصر غالب رہا ہے بڑی خوشی کی بات ہے کہ ادھر چند برسوں سے تنقید میں معروضی انداز پیدا ہو رہا ہے چنانچہ شمس الرحمٰن کی تنقید اور تبصروں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے مجھے خوشی ہے کہ میری فرمائش پر شمس الرحمٰن فاروقی نے شعر کے ابلاغ کے مسئلہ پر مقالہ لکھا۔ سرور صاحب نے روایت اور جدیدیت کے حامیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ادب میں یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے اور رہنا چاہیے اور قدیم و جدید کی کشمکش کو ادبی تاریخ کے پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور کسی ایک رنگ، اسلوب یا لہجہ پر اصرار نہیں کرنا چاہیے بلکہ بقول [illegible] چمن میں سو طرح کے پھول کھلنے چاہییں۔

سرور صاحب کی تقریر کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنا مقالہ پڑھا اس مقالہ میں فاروقی صاحب نے شعر کے ابلاغ کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان مختلف ذرائع کی وضاحت کی جو شعر اور نثر اپنے ابلاغ کے لیے استعمال کرتی ہے اور اس نمایاں فرق اور اختلاف کی طرف توجہ دلائی جو نثر اور شعر کے ابلاغ کی سطحوں میں پایا جاتا ہے۔ موجودہ تنقید میں ترسیل اور ابلاغ کی اصطلاحوں کو ہم معنی سمجھ کر جس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کہا کہ ان دونوں اصطلاحوں کو استعمال کرتے وقت خاصا محتاط رہنے کی ضرورت ہے فاروقی صاحب نے [illegible] کے مشہور نظریہ سے اپنا اتفاق ظاہر کیا۔ اصل مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے ترسیل اور ابلاغ کے تعلق اور فرق کو واضح کیا اور کہا کہ ابلاغ شعر کی آخری منزل ہے ایک طرف تو ابلاغ وہ عمل ہے جو شعر پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں واقع ہوتا ہے جب شعر پڑھ کر میں نے ان تجربات اور کیفیات کا کسی نہ کسی حد تک احاطہ کر لیا جنھوں نے اس شعر کو جنم دیا تھا، تو مجھے ابلاغ حاصل ہو گیا۔ دوسری طرف ابلاغ صحت کے اس درجہ کا نام ہے جس درجہ تک شاعر کی بود و آگہی نے لفظی ترسیل کی صورت اختیار کی ہے۔ غور سے دیکھیے تو دونوں کیفیتیں تقریباً ایک ہی ہیں کیونکہ میں اور خود شاعر شعر کو اس حد تک سمجھ سکتا ہے جس حد تک وہ الفاظ کے اندر محدود ہے اس خیال کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کئی مثالیں دیں اور شعر کی ماہیت کے سلسلہ میں مشرق و مغرب کے افکار کی بھی

کا ذکر کیا۔ انھوں نے نقادی جو دھی سمر قندی، شبلی، امیر عنصر المعالی، ہوریس، ارسطو، کولرج، رچرڈز اور بعض دوسرے اہم ناقدین کے خیالات اپنے نقطۂ نظر کی تائید کے لیے پیش کیے۔ اور جدید و قدیم شاعروں کے بعض نمونوں کی تشریح بطور مثال پیش کی۔ شاعری میں علامت استعارہ پیکر اور تشبیہ کی اہمیت، نوعیت، لغوی زبان اور زبان کے مروجہ استعمال سے ان کا اختلاف ظاہر کیا۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ شاعر علامتوں یا علامتی استعاروں کا استعمال صرف زیبائش کے لیے نہیں کرتا لیکن زیبائش علامت یا استعارہ کا ایک اہم حصہ ہوتی ہے۔ اگر ہم خود کو علامت کے مقصود بالذات بھی ہونے کے تصور سے مانوس کرلیں تو ابلاغ کی آغازی الجھن رفع ہوسکتی ہے۔ مقالے کے بعد حاضرین جلسہ میں بعض نے فاروقی صاحب سے ان کے مقالہ اور جدید شاعری کے بعض اہم رجحانات کے سلسلہ میں سوالات کیے۔ شمس الرحمٰن نے ان سوالات کا مفصل جواب دیا اور اپنے خیالات کی مزید وضاحت کی۔

آخر میں صدر جلسہ پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ مقالہ پر جو سوالات کیے گئے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مقالہ توجہ سے سنا گیا ہے اور اس مسئلے سے جو دوسرے ادبی مسائل وابستہ ہیں ان سے لوگ باخبر ہیں۔ میں فاروقی صاحب کو اس مقالہ پر مبارکباد دیتا ہوں کہ انھوں نے ابلاغ کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور سنجیدگی سے شعر کے ابلاغ کی اہمیت اور نوعیت سے بحث کی ہے اور اس بحث میں مشرق و مغرب کے اہم ناقدین کے خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف مشرق یا صرف مغرب کے اسیر نہیں ہیں بلکہ جہاں کہیں کوئی سنجیدہ اور اہم بات ان کو ملتی ہے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تنقید کی اہمیت اور اس کے مقصد پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ ہم اچھے اور برے، سیاہ اور سفید کے اتنے عادی ہوگئے ہیں کہ چیزوں کو سمجھنے سے پہلے ہی ان پر فیصلہ صادر کردیتے ہیں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو چیز سیاہ نہیں ہے وہ سفید ضرور ہوگی۔ ادب کے سلسلہ میں یہ رویہ خاصا خطرناک ثابت ہوا ہے۔ ہمیں کسی رنگ پر فیصلہ کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ رنگ کیا ہے کیسا ہے اس کی اپنے دور سے کیا نسبت ہے عالمی اور آفاقی رجحانات سے اس کا کیا تعلق ہے اور وسیع تر انسانیت کے لیے اس میں کون سی کشش ہے۔ اس کے بعد ہی ہم صحیح فیصلے تک پہنچ سکیں گے نثر اور شعر کے طریقۂ کار کی وضاحت کرتے ہوئے سرور صاحب نے کہا کہ ہم آم میں املی اور شفق میں صبح کا منظر ڈھونڈتے ہیں اور بعد میں مایوس ہوکر غلط فیصلے صادر کرتے ہیں۔ شعر کی زبان اور ابلاغ کے سلسلہ میں غالب کے اس شعر کو ذہن میں رکھنا چاہیے ۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

یہاں غالب نے لفظ کو گنجینۂ معنی کا طلسم کہا ہے اس سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ شعر میں جو لفظ استعمال ہوتا ہے اس کے صرف ایک معنی نہیں ہوتے بلکہ ایک سے زیادہ ہوتے ہیں۔ شعر دراصل زندگی

نسبتاً سادہ بھی اسی لیے ہر زبان کی ابتدائی شاعری سادہ اور عام فہم ہے لیکن جیوں جیوں انسان ترقی کی منزل طے کرتا گیا زندگی میں پیچیدگی پیدا ہوتی گئی۔ آج کی شاعری کے سلسلہ میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان میں سب سے اہم اعتراض ابہام کا ہے لیکن معترض کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ ابہام کی وجہ بعض معاملات، مسائل اور علوم سے خود ان کی ناواقفیت بھی ہوسکتی ہے شاعر پوری انسانی تہذیب سے استفادہ کرتا ہے وہ دیومالا سے بھی استفادہ کرتا ہے اور مصوری، موسیقی اور طرز تعمیر سے بھی۔ آج کی شاعری کو سمجھنے کے لیے جدید مصوری اور طرز تعمیر سے بھی واقفیت بہت ضروری ہے۔

پیچیدگی اور تہ داری فن کی جان ہیں۔ موجودہ دور میں بعض ناگزیر اسباب سے سستی چیزیں زیادہ مقبول ہورہی ہیں اور بعض لوگوں سے ان چیزوں کو معیار ماننے کی بھی بہت زیادہ عام فہم تخلیقات کا مطالبہ کیا جارہا ہے ہمیں اس سلسلہ میں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ محض کوئی معمہ بازی اور جنسی ذوق سے بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے کہا تھا کہ جب شاعر کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں تو زمانے کی آنکھیں بند ہوتی ہیں زمانے سے یہاں وہ فرسودہ ذہن کے لوگ مراد ہیں جو حالات کی وجہ سے سطحی چیزوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض یہ ہے کہ شعر کے ابلاغ کے سلسلے میں سارا بوجھ شاعر پر ڈال کر الگ نہ ہوجائیں بلکہ اس کی ذہنی فضا تک پہنچنے کی خود بھی کوشش کریں۔

([illegible])

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے وفد کی لسانی اقلیتی کمشنر سے ملاقات

کلکتہ ۔ اسسٹنٹ لسانی اقلیتی کمشنر کے ساتھ انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی حالیہ ملاقات کا نتیجہ بہت ہی مایوس کن برآمد ہوا ہے سب سے اہم بات یہ ہے کہ مغربی بنگال کے دو سابق وزرائے اعلیٰ نے ریاست میں اردو کو علاقائی زبان کا درجہ دینے کے جو وعدے کیے تھے اب اس سے صاف انکار کردیا گیا ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ مرکزی حکومت کے قانون کے مطابق صرف ان ہی اضلاع میں کسی زبان کو یہ درجہ دیا جاسکتا ہے جہاں ساٹھ فیصد لوگ اس زبان کے بولنے والے ہوں۔ البتہ کسی زبان کے پندرہ فیصد بولنے والے کسی تحصیل یا سب ڈویژن میں ہوں تو وہاں اس زبان میں سرکاری اعلانات وغیرہ شائع کیے جاسکتے ہیں۔ دوسری مایوس کن خاص بات یہ ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت مغربی بنگال میں غیر اردو داں طلبہ کو یہ اجازت نہیں مل سکتی کہ اگر وہ چاہیں تو اردو کو تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھ سکیں۔ (آزاد ہند)

"ہماری زبان"

مضامین و مراسلات بھیجتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔

آل احمد سرور

میرا صفحہ

میں نے گورکی پر ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا تھا۔

"تخلیق ادب کو نظر کی ضرورت ہے، نظریے کی نہیں۔ ہاں تنقید میں نظریے کی ضرورت مسلم ہے۔" میں اس بات کو کسی آئندہ مضمون میں واضح کرنا چاہتا تھا، مگر حال میں ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ کا ایک خاص نمبر دیکھا جو CROSS CURRENTS کے عنوان سے نکلا ہے۔ اس میں جوناتھن ملر کا ایک مضمون اختلافات سے پرے (BEYOND DISPUTES) پڑھا تو اس عبارت پر نظر ٹھہر گئی۔ ہماری زبان کے پڑھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ میں سہولت کے لیے صرف ترجمہ دے رہا ہوں اور ترجمہ بھی قلم برداشتہ ہے:

"کسی ادبی بصیرت کی مخصوص انفرادیت مجروح ہوتی ہے، جب اسے ایک خیال سے جوڑ دیا جائے جو اس حد تک غلط بھی جاتا ہے کہ ایک (DOGMA) بن جاتا ہے۔ ڈرامے یا ناول جو مارکس کے مطابق قطع کئے جاتے ہیں ایسے ہی صدمے سے دوچار ہوتے ہیں۔ بریخت کے بہترین کھیلوں میں ڈرامائی زندگی اس وقت نمودار ہوتی ہے جب ڈراما نویس کا وسیع ادبی تصور، مارکس کی بصیرت کو جذب کر لیتا ہے بجائے اس کے کہ اس کے شاگردوں کے DOGMA کے تابع کر دیا جائے۔" صفحہ ۹۵۲، ۲۰ جولائی ۱۹۶۷ء۔

ملر نے فرائڈ کے سلسلے میں بھی اس بات پر زور دیا ہے۔ وہ کہتا ہے "جہاں جہاں فرائڈ کی تصانیف سے واضح طور سے ادب کی بنیاد رکھی گئی ہے، ناول یا ڈراما کو ذہنی نقصان پہنچا ہے۔"

ملر اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ ادیب کی مخصوص بصیرت کو مارکس کے خیالات سے یا فرائڈ کے نظریات سے عملی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے، مگر یہ سب چیزیں اس کا خام مواد ہیں۔ اس خام مواد کو جب وہ ادبی روپ دیتا ہے تو وہ سماجی صحیفہ، نفسیاتی مقالہ یا حکمت پر رسالہ نہیں لکھتا، اور سماجی، نفسیاتی یا فلسفیانہ موضوعات کی وجہ سے اس کے فن پارے کی قدر و قیمت نہیں بڑھتی بلکہ فن پارے کی مجموعی قدر و قیمت زندگی کا فنکارانہ بصیرت، زندگی کی پیچیدگی، اس کے رچاؤ اس کی معنویت پر روشنی ڈالنے کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی ادب کو نہ سائنس کی غلامی کرنی چاہیے نہ اقتصادیات اور سماجیات کی چاکری۔ ادب ان علوم کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔ اور اس کی اپنی دنیا میں یہ علوم اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ علوم میں نظریے پچھلے نظریوں کی روش پر قائم ہوتے ہیں۔ جدید علوم نے قدیم علوم کو باطل کر دیا ہے اور اب ان کی صرف تاریخی حیثیت رہ گئی ہے۔ مگر جدید ادب نے قدیم ادب کو باطل نہیں کیا۔ ادب وہ خاص علم دیتا ہی نہیں جو تجدید میں بدل جائے۔ ادب تو وہ عمومی بصیرت، وہ عام احساس، وہ عرفان دیتا ہے جو کبھی غلط نہیں ہو سکتا ہاں ہلکا یا گہرا، وسیع یا علاقائی ہو سکتا ہے، مگر جس میں تازگی اور توانائی رہتی ہے۔

اگر اردو میں ادب کی اس مخصوص بصیرت کا عرفان عام ہو جائے تو نہ تو ادب کو بعض علوم کے مطابق کرنے کی کوشش ہوگی، اور نہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے علوم کی کتابوں سے حوالے کی ضرورت پڑے گی۔ یعنی ادب فرائڈ کے لیے یا مارکس کے لیے یا مذہب کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے یا سیاست کے ہیچ کرنے کے یا اس کی ضروریات کا جواز پیش کرنے کے کام نہ آئے گا۔ وہ زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے کا ایک ذریعہ ہوگا جس میں بچے کی دعا سے لے کر دیوانے کا خواب تک سبھی کچھ آسکے گا۔

مگر ادب کو یہ آزادی دینے کے لیے کوئی تیار نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خود ادیب بھی اس کے لیے نئی نئی زنجیریں تراشتے رہتے ہیں یا سے ہدایت نامے لکھتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح ادب کو برگزیدہ بنا رہے ہیں اور افسانہ داستانوں کے غبار سے علم و حکمت کے مینار تعمیر کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ افسانہ واقعی اپنی اثر پذیری کے لیے بھی حقیقت کے محتاج ہیں، مگر یہاں حقیقت اپنی منجمد شکل میں نہیں سیال حالت میں آتی ہے اور اس طرح ایک ایسی حقیقت بن جاتی ہے جو سائنسی یا عقلی یا معروضی یا خارجی حقیقت سے کسی طرح کم اہم نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے فنکار کو اپنی تخلیق کسی علمی نظریے کی بنا پر نہیں کرنی چاہیے، ہاں اس کی نظر میں ماہ و انجم کے جلووں کے ساتھ دانش و فرہنگ کا سرمایہ بھی ہونا چاہیے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ہرن کو دیکھتے ہی کچھ لوگ اس پر گھاس لادنے کی سوچنے لگتے ہیں۔ بیچارہ ہرن!

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ادیب کی بڑائی اس کے پیچھے نظریے کی بڑائی یا صحت میں نہیں، فن کار کی نظر کی گہرائی، اس کے فن کا راز خلوص اور اس خلوص میں شدت، اس کے اپنے تجربے کی پیچیدگی اور اس کے رچاؤ میں ہے۔ جب تک ادب ان ادبی معیار پر پورا نہیں اترتا، اچھا ادب نہیں کہا جا سکتا۔ ادب اور صحافت میں یہی فرق ہے کہ صحافت وقتی موضوعات کو ہی ابدی اہمیت دے دیتی ہے، ادب وقتی موضوعات کو ابدی معنویت کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ خاص واقعات سے اسے غرض نہیں، عمومی صداقتوں سے بحث ہے۔ ارسطو سے اب تک ادب کے پارکھ اس چیز پر زور دیتے رہے ہیں۔

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا